مِلاكُ التأوِيل (۹)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورۃ آل عمران

(۵۶) آیت ۱۳۳ :

﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ......﴾

’’دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی زمین و آسمان (کی طرح) ہے۔‘‘

اور سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ (آیت ۲۱)

’’اور سبقت لے جاؤ اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کی مانند ہے۔‘‘

دونوں جگہ نیک اعمال کے کرنے پر اور اس کے بدلے میں بہت بڑے ثواب حاصل کرنے پر ابھارا گیا ہے‘ لیکن عبارت میں ذرا سا اختلاف ہے۔ پہلی آیت میں ’’السَّمٰوٰتِ‘‘ سے پہلے مضاف محذوف ہے (یعنی مثلَ السَّمٰوٰت) اور دوسری آیت میں اس کی جگہ ’’کاف‘‘ لایا گیا ہے جو تشبیہ کے لیے لایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں ’’السَّمٰوٰت‘‘ جمع کا صیغہ ہے اور دوسری آیت میں ’’السَّمَآء‘‘ مفرد کا صیغہ لایا گیا ہے۔ یہ کل تین سوال بنتے ہیں۔

پہلے سوال کے جواب میں عرض ہے —— وَاللّٰہُ اَعْلَمُ —— کہ کسی چیز کی طرف مسارعت (جلدی کرنا‘ دوڑنا) مسابقت سے پہلے ہوتی ہے اور ہم نے اپنی کتاب ’’البرہان‘‘ میں یہ بات بیان کی ہے کہ سورتوں کی ترتیب میں اس پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے‘ جبکہ آیات کی ترتیب میں ضروری نہیں کہ اس کا خیال رکھا جائے۔ اور اسی لحاظ سے مسارعت کا ذکر پہلے آیا ہے اور مسابقت کا ذکر بعد میں۔ کیا یہ بات دیکھنے میں نہیں آتی کہ ایک شخص جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے‘ پہلے اُس کی طرف لپکتا ہے‘ اور کبھی وہ چیز اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور کبھی نہیں آتی ہے‘ اور عام طور پر یہ کہنا کہ فلاں شخص سبقت لے گیا ہے‘ اسی وقت کہا جاتا ہے جبکہ اسے وہ چیز حاصل ہو

گئی ہو جس کی طرف اس نے دوڑ لگائی تھی۔ اب دیکھئے کہ مسارعت کا ذکر سبقت سے پہلے ہے۔ فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝۶۱﴾ (المؤمنون)

''اور وہ لوگ نیکیوں کی طرف جلدی کرتے ہیں اور وہ ان کے لیے سبقت کرنے والے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝۱۰۱﴾ (الانبیاء)

''اور جن کے لیے ہماری طرف سے نیکی پہلے ہی لکھی جا چکی ہے وہ جہنم سے دور رہیں گے۔''

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

سَبَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَثَنّٰى اَبُوْبَكْرٍ وَثَلَّثَ عُمَر (مسند امام علی)

''رسول اللہ ﷺ سبقت لے گئے' حضرت ابوبکر دوسرے نمبر پر اور عمر تیسرے نمبر پر رہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴﴾ (النّزعٰت) کے بارے میں کہا گیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ فرشتے وحی کے سننے میں جنوں پر سبقت لے جاتے ہیں' اور اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ مسارعت مسابقت سے پہلے ہے' اس لیے قرآن کی ترتیب میں اسی لحاظ سے دونوں لفظ وارد ہوئے ہیں۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ آل عمران کی آیت میں حذف واقع ہوا ہے' یعنی ''عرضُها مثلُ عرضِ السَّمَاوات والارض''۔ سورۃ الحدید میں کافِ تشبیہ لا کر اس حذف کی نشاندہی کر دی گئی' کیونکہ وہ بھی ''مثل'' ہی کے معنی میں ہے۔ اگر مبالغہ مقصود ہو تو عموماً حذف کر دیا جاتا ہے اور اسی طرح ایک چیز کی صفت اس طرح بیان کرنا کہ وہ خود وہی چیز ہے' جیسے یوں کہا جاتا ہے:

''نهارُكَ صائِمٌ ولَيْلُكَ قَائِمٌ''

''تمہارا دن روزے دار ہے اور تمہاری رات قیام ہی قیام ہے۔''

اور ان دونوں اشعار میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے:

انَّ الربيعَ الجُودَ والخَريفا — يدا ابی العباس وَالصُّيوفا

''ابو العباس کے نزدیک موسم بہار' خزاں اور گرما سب کے سب سخاوت ہیں'' ع

امَّا النَّهارُ ففی قيدٍ وَسِلْسِلَةٍ — وَاللَّيلُ فِیْ بَطْنِ مَنْحُوْتٍ مِنَ السَّاجِ

''دن تو بیڑیوں اور زنجیر میں رہتا ہے اور رات ساگوان کی لکڑی کے کھدے ہوئے پیٹ میں گزرتی ہے۔''

یہاں ایک شخص کے حالات بیان ہو رہے ہیں' لیکن دن اور رات کو ان حالات میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ اور اسی طرح پہلے شعر میں سخاوت ایک شخص کا وصف ہے لیکن زمانے کے تینوں ادوار کو ان اوصاف کا حامل قرار دیا گیا ہے۔

''عرضُها السَّمٰوٰت والارض'' کو بھی اسی طرح سمجھنا چاہیے' یعنی اگر آسمانوں اور زمین کے ساتھ ساتھ صف بندی کی جائے تو وہ جنت کا عرض بن جائے گی۔ جریر کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

لَقَدْ لُمْتِنَا يَا اُمَّ غَيْلَانَ فِی السُّرَى — ونِمْتِ وما لَيلُ المطیِّ بنائم

''اے اُمِّ غیلان! تم ہمیں رات کے چلنے پر ملامت کرتی ہو' تم سوتی ہو لیکن سواری کی رات سوتی نہیں ہے۔''

یہاں رات کے ساتھ سونے کی صفت بیان کی گئی ہے' حالانکہ یہ وصف سواروں کا ہے' نہ کہ رات کا' یعنی ان دونوں اشعار میں ''ذُو'' محذوف ہے' ذوالنھار' ذواللیل' ذولیل المطی ہونا چاہیے تھا' لیکن مبالغہ مقصود تھا اس لیے مضاف کو محذوف کر دیا گیا۔ (مؤلف نے یہاں مثال کے طور پر ایک اور شعر رقم کیا ہے جو طوالت سے بچنے کے لیے حذف کر دیا گیا ہے: مترجم)

سورۂ آل عمران کی آیت کو بھی اس تفصیل کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے' اور خلاصہ کلام یہ ہے کہ جہاں مبالغہ مقصود ہو وہاں اختصار سے کام لیا جاتا ہے' یا تو حذف کا طریقہ اپنایا جاتا ہے یا وصف ہی کو موصوف قرار دیا جاتا ہے اور یا پھر ایک لفظ کا اعادہ کیا جاتا ہے تاکہ اس کی بڑائی یا ہولناکی کا اندازہ ہو سکے اور یہ تکرار بمنزلہ وصف کے ہوتی ہے' جیسے ارشاد فرمایا: ﴿اَلۡحَآقَّةُ ۝١ مَا الۡحَآقَّةُ ۝٢ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحَآقَّةُ ۝٣﴾ (الحاقة) اور ﴿اَلۡقَارِعَةُ ۝١ مَا الۡقَارِعَةُ ۝٢ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ۝٣﴾ (القارعة) سیبویہ نے اس کی مثالیں مختلف ابواب میں بیان کی ہیں۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ آل عمران میں السمٰوٰت کا صیغہ جمع لایا گیا ہے اور سورۃ الحدید میں ''کَعَرۡضِ السَّمَآءِ'' کہہ کر صیغہ مفرد لایا گیا ہے تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سورۃ آل عمران میں ''عَرۡضُهَا'' مبتدأ ہے اور چونکہ اس کی خبر ایک مجموعہ ہے اس لیے ''السَّمٰوٰت'' بصیغہ جمع لانا مناسب تھا' اور جیسا ہم نے پہلے واضح کیا ہے کہ یہاں مبالغہ اور تعظیم مقصود تھا اور اسی وجہ سے وہ لوگ جن کے لیے یہ جنت تیار کی گئی ہے' اُن کے اوصاف بیان کیے گئے' انہیں متقین کے لفظ سے یاد کیا گیا اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان کی تمام شاخوں کا احاطہ کیا ہوا ہے اور جس کی تفصیل آیۃ البر میں موجود ہے۔ فرمایا: ﴿لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ......﴾ اور یہ اوصاف آیت کے اس حصے پر ختم ہوتے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ۝١٧٧﴾ (البقرة)

اور اب سورۃ آل عمران اور سورۃ الحدید کی آیات میں فرق بھی دیکھ لیجیے:

سورۂ آل عمران میں ''السمٰوٰت'' جمع کے صیغے کے ساتھ ہے اور ''الحدید'' میں واحد کا صیغہ ہے۔ سورۂ آل عمران میں ﴿اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ﴾ ہے اور سورۃ الحدید میں ﴿اُعِدَّتۡ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ ہے۔ چونکہ آلِ عمران کی سورت میں مبالغہ مقصود تھا اس لیے وہاں جنت کا عرض خود آسمانوں اور زمین کو قرار دے دیا' اور سورۃ الحدید میں' جہاں کہ مبالغہ مقصود نہ تھا' کافِ تشبیہ لا کر جنت کے عرض کو آسمان اور زمین کے مثل ہونے کا بیان کیا گیا۔

پھر اگر یہ کہا جائے کہ سورۃ آل عمران میں مبالغہ کیوں مقصود ہے اور سورۃ الحدید میں کیوں نہیں؟ تو ہم کہیں

گے: وہ اس لیے کہ سورۃ آل عمران میں جہاد پر ابھارا گیا ہے‘ جہاد کی فضیلت بیان کی گئی ہے‘ آیت ﴿وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ﴾ (آیت ۱۲۱) سے یہ بیان شروع ہوتا ہے‘ بدر واُحد کا تذکرہ ہے‘ جبکہ سورۃ الحدید میں ان باتوں کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے ہر دو سورتوں کے الفاظ اپنی اپنی جگہ مناسب ہیں۔ واللہ اعلم!

(۵۷) آیت ۱۳۶ :

﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَجَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ﴿۱۳۶﴾﴾

’’ان کی جزا یہ ہے کہ ان کے رب کی طرف سے بخشش ہوگی اور ایسی جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اور کیا ہی اچھا ہے (نیک) کام کرنے والوں کا اجر وثواب!!‘‘

اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرمایا:

﴿لَنُبَوِّئَنَّهُمۡ مِّنَ الۡجَنَّةِ غُرَفًا تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ﴿۵۸﴾﴾

’’ہم انہیں جنت کے ان بالا خانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی‘ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا اجر ہے (نیک) کام کرنے والوں کا!‘‘

سوال یہ ہے کہ پہلی آیت میں ﴿وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ﴾ ہے‘ یعنی واؤ عاطفہ کے ساتھ‘ اور دوسری آیت میں ﴿نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ﴾ واؤ عاطفہ کے بغیر ہے‘ تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ پہلی آیت میں اہل ایمان کی جزا تفصیلی طور پر بیان ہوئی ہے اور جزا کے دونوں جملوں میں واؤ عاطفہ بھی ہے‘ اس لیے مناسب ہوا کہ آخری جملے سے قبل بھی واؤ عاطفہ لایا جائے کہ جس میں ان کی مدح و توصیف بیان ہو رہی ہے۔ اس کے بالمقابل دوسری آیت میں جزا کے ذکر میں کوئی عطف نہیں ہے‘ اس لیے آخری جملے سے قبل بھی واؤ عاطفہ نہیں لایا گیا۔ واللہ اعلم!

(۵۸) آیت ۱۶۴ :

﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ......﴾

’’بے شک اللہ نے اہل ایمان پر احسان کیا کہ ان میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا......‘‘

اور سورۃ الجمعہ میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ......﴾ (آیت ۲)

’’وہی (اللہ) ہے جس نے اُمی لوگوں میں ایک رسول ان میں سے بھیجا......‘‘

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ دونوں آیتوں کا مقصد تو ایک ہی ہے کہ عربوں پر یہ احسان جتلایا جائے کہ اللہ نے انہی میں سے ایک رسول ان کی طرف بھیجا ہے‘ لیکن عبارت میں یہ اختلاف کیوں ہوا کہ

پہلی آیت میں ''مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ'' (انہی کے نفوس میں سے) وارد ہوا اور دوسری آیت میں ''مِنۡهُمۡ'' (ان میں سے) کہا گیا؟

اس کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ ''فلاں اس قوم کے نفوس میں سے ہے'' تو اس میں قرب اور خصوصیت کا اظہار زیادہ ہے بہ نسبت یہ کہ صرف یوں کہا جائے کہ ''فلاں ان میں سے ہے۔''

اس قول میں نوع تو مراد ہوسکتی ہے (یعنی فلاں عربی ہے یا عجمی: مترجم) لیکن قرب اور شرف بغیر قرینے کے معلوم نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر ''مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ'' کہہ دیا تو پھر کسی قرینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دیکھئے جہاں رسول اللہ ﷺ کی آمد کو ایک عظیم نعمت کی حیثیت سے ظاہر کرنا تھا اور یہ دکھانا تھا کہ وہ اہل ایمان کے ساتھ بڑی شفقت اور رحمت رکھتے ہیں اور ان کی نجات کے دل و جان سے خواہاں ہیں وہاں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا۔ فرمایا:

﴿لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ﴾ (التوبۃ:۱۲۸)

''بے شک تمہارے پاس ایک رسول تم ہی میں سے آیا ہے۔''

اور اس کے مقابلہ میں جب ان لوگوں کا ذکر آیا جو اہل ایمان کے برعکس معاملہ کر رہے تھے تو پھر صرف ''مِنۡهُمۡ'' پر اکتفا کیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡهُمۡ فَكَذَّبُوۡهُ﴾ (النحل: ۱۱۳)

''اور بے شک ان میں سے ایک رسول ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔''

غور کیجیے کہ یہاں گو ان پر نعمت کا اظہار مقصود ہے' لیکن جب ان لوگوں نے آپ ﷺ کی قدر نہ کی اور آپؐ کی آواز پر لبیک نہ کہا تو پھر صرف ''مِنۡهُمۡ'' پر اکتفا کیا گیا۔ اب رہا یہ کہ آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں یوں کہا: ((سلمان مِنَّا اَهۡلَ الۡبَيۡتِ)) ''سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے'' تو اس کی تشریح یہ ہے کہ چونکہ سلمان قریش میں سے نہ تھے اور آنحضور ﷺ نے ان کی قدر و منزلت کا اظہار کرنا چاہا تو مذکورہ الفاظ کہے جن میں ''مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ'' یا ''مِنۡ اَنۡفُسِنَا'' والی خصوصیت تو نہیں ہے لیکن ''اہل البیت'' کے الفاظ وہ قرینہ ہیں جن سے ان کی قرب و منزلت کا اظہار ہوتا ہے۔

اور رہا آپ ﷺ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ کہنا: ((اِنَّمَا هِيَ بَضۡعَةٌ مِنِّيۡ)) ''بے شک وہ تو میرا ہی ایک ٹکڑا ہے۔'' (بخاری۔ مسلم) تو یہاں دو طرح سے انتہائی خصوصیت کا اظہار ہو رہا ہے: پہلی تو یہ کہ ''مِنِّي'' کہا نہ کہ ''مِنَّا''۔ پہلے لفظ میں خصوصی قربت کی طرف اشارہ ہے جبکہ دوسرے لفظ میں عموم جھلکتا ہے۔ دوسری یہ کہ انہیں اپنی ذات کا ٹکڑا اقرار دیا کہ جس سے بڑھ کر اور کوئی قربت نہیں ہوسکتی ہے۔ اب رہا یہ ارشاد کہ ((مَوۡلَى الۡقَوۡمِ مِنۡهُمۡ)) کہ آزاد کردہ غلام قوم ہی میں سے ہوتا ہے (بخاری)' تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ وَلَاء (آزاد کرنے سے جو رشتہ قائم ہوتا ہے) وہ نسبی رشتے سے قربت رکھتا ہے' لیکن وہ ''مِنۡ

اَنۡفُسِھِمۡ'' کے مقام کو نہیں پہنچتا ہے۔ اب یہاں یہ بات واضح ہوگئی کہ درجاتِ قرب کے اعتبار سے پہلے ''مِنۡ اَنۡفُسِھِمۡ'' آئے گا اور پھر ''مِنۡھُمۡ'' ۔ اور ''مِنَّا'' میں اور زیادہ خصوصیت اور اپنائیت ہے' کیونکہ اس میں وہ عموم نہیں ہے جو پہلے دونوں حروف میں پایا جاتا ہے۔

اب ملاحظہ کریں کہ سورۃ الجمعہ میں اُمّیین (ناخواندہ) عربوں میں رسول کے بھیجے جانے کا ذکر تھا' جن میں ہر طرح کے عرب تھے' وہ بھی جو اسلام لے آئے اور وہ بھی جو مسلمان نہ ہوئے' اس لیے ان کے لیے ''مِنۡھُمۡ'' کہنا زیادہ مناسب تھا۔ برخلاف سورۃ آل عمران کی آیت کے جہاں اہل ایمان کا ذکر تھا' اس لیے یہاں ''مِنۡ اَنۡفُسِھِمۡ'' لانا زیادہ بہتر تھا کہ یہاں خصوصیت کا اظہار بھی مقصود تھا۔ اللہ اعلم!

(۵۹) آیت ۱۶۷ :

﴿یَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاھِھِمۡ مَّا لَیۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ ؕ﴾

''اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔''

اور سورۃ الفتح میں ارشاد فرمایا:

﴿یَقُوۡلُوۡنَ بِاَلۡسِنَتِھِمۡ مَّا لَیۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۱)

''اور اپنی زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔''

سوال یہ ہے کہ دونوں آیتوں کا مقصود ایک ہی ہے کہ کچھ لوگ بظاہر وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے باطن میں نہیں ہے' تو اگر مقصود ایک ہی ہے تو ایک آیت میں ''بِاَفۡوَاھِھِمۡ'' اور دوسری آیت میں ''بِاَلۡسِنَتِھِمۡ'' کیوں کہا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے' واللہ اعلم' کہ ''بِاَفۡوَاھِھِمۡ'' (اپنے منہ سے) کہہ کر اپنے اعتقاد یا ارادے کو نہایت مبالغے اور مضبوطی کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے جو کہ صرف ''بِاَلۡسِنَتِھِمۡ'' (اپنی زبانوں سے) سے حاصل نہیں ہوتا۔

عربی میں مبالغے کے لیے کہا جاتا ہے: ''تکلّم بملء فیه'' (وہ منہ بھر کے بولا) اور قرآن ہی میں ارشاد ہوا: ﴿اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاھِھِمۡ﴾ (یٰس:٦٥) ''آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے۔''

یہاں بھی ان کے بات کرنے سے روکے جانے پر مبالغہ کا اظہار مقصود ہے' کیونکہ اگر منہ پر مہر لگ جائے تو زبان خود بخود بات نہ کر سکے گی' تو یہاں بات نہ کرنے پر قادر نہ ہونے کو بلیغ انداز میں بیان کیا گیا۔

اب دیکھیے کہ پہلی آیت میں منافقین کا بیان تھا' جیسے عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی جن کا نفاق ثابت ہو چکا تھا۔ اس شخص نے جنگ اُحد کے دن ان انصاریوں کے بارے میں کہا تھا جو شہادت سے سرفراز ہوئے تھے:

﴿لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ؕ﴾ (آل عمران: ١٦٨)

''اگر وہ ہماری اطاعت کرتے تو نہ مارے جاتے۔''

اس کے علاوہ بھی باتیں بنائیں' پھر اپنی پاکیزگی کا اظہار یوں کیا:

﴿لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعۡنٰكُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۶۷)

''اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ لڑائی ہوگی تو ہم تمہارے پیچھے پیچھے آتے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کا پردہ چاک کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَـيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۶۷)

''وہ اس دن بہ نسبت ایمان کے کفر سے زیادہ قریب تھے' اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے تھے جو ان کے دلوں میں نہ تھا۔''

سورۃ الفتح کے مخاطب وہ بدوی عرب تھے جن کے بارے میں سورۃ الحجرات میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا......﴾ (آیت ۱۴)

''بدو عربوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے' (اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم اسلام لائے......''

یہ لوگ منافقین کی مانند نہ تھے کہ جن کا نفاق بہت گہرا تھا' ان میں نفاق نہ تھا بلکہ نئے نئے مسلمان ہونے کی بنا پر ایمان میں کمزوری ضرور تھی' چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿سَيَقُوۡلُ لَكَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ شَغَلَـتۡنَاۤ اَمۡوَالُنَا وَاَهۡلُوۡنَا فَاسۡتَغۡفِرۡ لَـنَا ۚ﴾ (آیت ۱۱)

''بدوؤں میں سے جو پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے وہ تم سے کہیں گے کہ ہمیں مال و دولت اور بال بچوں نے مشغول کیے رکھا' تو آپ ہماری بخشش کی دعا کریں۔''

اور انہی لوگوں کے بارے میں اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

﴿يَقُوۡلُوۡنَ بِاَلۡسِنَتِهِمۡ مَّا لَـيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ﴾

''وہ اپنی زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔''

تو یہاں ان کی زبانوں کا تذکرہ کیا گیا تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ یہ لوگ ان منافقین کی مانند نہیں ہیں جن کا تذکرہ سورۃ آل عمران میں کیا گیا ہے' اور چونکہ یہ دو مختلف قسم کے لوگ تھے اس لیے ان کی کیفیت کے بیان میں عبارت میں اختلاف کو ملحوظ رکھا گیا۔ ہر کلمہ اپنی جگہ مناسب تھا اور اگر اس کا الٹ کیا جاتا تو مناسب نہ ہوتا۔ واللہ اعلم!

(۶۰) آیت ۱۸۴:

﴿فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقَدۡ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ جَآءُوۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالۡكِتٰبِ الۡمُنِيۡرِ ۝۱۸۴﴾

''اور اگر ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے تو آپ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے' جو کھلی کھلی نشانیاں' صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔''

اور سورۃ فاطر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ۝۴﴾

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو آپ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے' اور تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

دونوں آیتوں میں کلمہ ''رُسُل'' نائب فاعل ہے اور جمع تکسیر کے صیغے کے ساتھ آیا ہے' اور عربی قواعد کے اعتبار سے جمع تکسیر کے لیے مذکر اور مؤنث دونوں صیغے لائے جاسکتے ہیں' اور اسی اعتبار سے پہلی آیت میں ''رُسُل'' کے لیے مذکر صیغہ (کُذِّبَ) لایا گیا اور دوسری آیت میں مؤنث صیغہ (کُذِّبَتْ) لایا گیا تو ایسا کیوں کیا گیا؟

جواب میں عرض ہے (واللہ اَعْلَم) کہ پہلی آیت میں نائب فاعل کے اوصاف کا اور دوسری آیت میں اس کے بعد آنے والے معطوف جملے کا لحاظ رکھا گیا ہے' اور اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ پہلی آیت میں ''رُسل'' کے اوصاف ﴿جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْکِتٰبِ الْمُنِیْرِ ﴿۱۸۴﴾﴾ جمع مذکر کے صیغے کے ساتھ لائے گئے ہیں' اس لیے یہاں ''رُسُل'' کے ساتھ مذکر کا صیغہ ہی مناسب تھا اور سورۃ الملائکۃ (فاطر) میں ''رُسُل'' کے بعد جو جملہ معطوف ہے اس میں بھی ''الامور'' سے پہلے مؤنث کا صیغہ لایا گیا ہے۔ اور اس اعتبار سے مناسب ہوا کہ دونوں جملوں میں یکسانیت کا لحاظ کرتے ہوئے دونوں اسماء (رُسل اور اُمور) کے ساتھ جمع تکسیر ہونے کی بنا پر مؤنث کا صیغہ لایا جائے' اور اگر اس کا برعکس کیا جاتا تو قطعاً مناسب نہ ہوتا۔ واللہ اعلم!

(۶۱) آیت ۱۸۶:

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾﴾

''اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بہت ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

اور سورۃ لقمان میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾﴾

''اور جو مصیبت تمہیں پہنچے تو اس پر صبر کر' بے شک یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

اور سورۃ الشوریٰ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾﴾

''اور جو صبر کرتا ہے اور معاف کرتا ہے تو بے شک یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

سوال یہ ہے کہ یہ فرق کیوں واقع ہوا ہے؟ (دو سورتوں میں ''مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ'' ہے' جبکہ تیسری سورت میں ''لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ'' ہے۔)

جواباً عرض ہے' واللہ اعلم' کہ ان آیات میں جن چیزوں پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے' ان میں کمی بیشی کی بنا پر یہ فرق واقع ہوا ہے۔ اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلی آیت میں صبر سے پہلے ارشاد فرمایا:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًی كَثِیْرًا ؕ﴾ (آل عمران: ۱۸۶)

’’تم اپنے مال اور اپنی جانوں میں آزمائش کا شکار ہو گے‘ اور تم بہت کچھ تکلیف دہ باتیں سنو گے ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیے گئے اور ان سے جنہوں نے شرک کیا۔‘‘

یہاں تین باتوں کا ذکر ہے‘ جان اور مال میں آزمائش کا آنا اور تکلیف دہ باتوں کا سننا‘ اور پھر ان پر صبر کا حکم دیا گیا اور اس طرح یہ چار باتیں ہو گئیں۔ یہاں ان دونوں فریق کا بھی ذکر ہو گیا جو تکلیف دہ باتیں کریں گے اور اس بات کا بھی ذکر ہو گیا کہ ان پر صبر کرنا بڑی ہمت والی چیزوں میں سے ایک ہے۔ سورۃ لقمان کی آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ لقمان حکیم اپنے بیٹے کو چار باتوں کی نصیحت کر رہے ہیں:

﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ؕ﴾

’’اے میرے چھوٹے بیٹے! نماز قائم کر‘ نیکی کا حکم دے‘ برائی سے روک اور جو مصیبت تجھے پہنچے اس پر صبر کر۔‘‘

اور ان چار نصیحتوں کے بعد کہا:

﴿اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾﴾

’’یقیناً یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔‘‘

دونوں آیات میں چار چار باتوں کا بیان ہوا جو سورۃ الشوریٰ کی آیات میں ذکر کردہ صفات کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ﴿اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾﴾ سے قبل بارہ صفات کا تذکرہ ہے۔

آیت ۳۶ سے ان صفات کا بیان شروع ہوتا ہے:

﴿فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ﴾

’’اور جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے۔‘‘

یعنی ان سے بچ کر رہنا چاہیے‘ پھر فرمایا:

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾

’’اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے ایمان لانے والوں کے لیے‘ اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔‘‘

یہاں ایمان اور توکل کا حکم دیا جا رہا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ہُمْ یَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾

’’اور جو لوگ بڑے گناہوں اور بدکاری سے بچتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کرتے ہیں۔‘‘

یہاں تین نصائح کا ذکر ہو گیا۔ پھر فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۠ وَاَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾

’’اور جو اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں‘ نماز قائم کرتے ہیں‘ آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔‘‘

یہاں مزید چار باتوں کا بیان ہو گیا۔ پھر فرمایا:

﴿وَالَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الۡبَغۡیُ هُمۡ يَنۡتَصِرُوۡنَ﴿۳۹﴾﴾

’’اور وہ لوگ جب زیادتی کا شکار ہوتے ہیں تو بدلہ لیتے ہیں۔‘‘

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ ظلم و زیادتی پر بدلہ لیتے ہیں اور ایسا کرنا ان کے لیے جائز ہے‘ برا نہیں ہے‘ کیونکہ اس کے بعد فوراً کہا:

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا ۚ﴾

’’اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔‘‘

اور اس کے بعد انہیں اس سے ارفع و اعلیٰ نیکی کی طرف رہنمائی کی‘ ارشاد فرمایا:

﴿فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۰﴾﴾

’’اور جو معاف کرتا ہے اور اصلاحِ احوال کرتا ہے تو اللہ اسے اجر عطا فرمائے گا۔ بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

اور اگلی آیت میں واضح کر دیا کہ گو معاف کرنا بہتر ہے لیکن اگر کوئی ظلم و زیادتی کا بدلہ لے لے تو اس پر کوئی الزام نہیں تراشا جا سکتا‘ الزام تو درحقیقت ان لوگوں کو دیا جانا چاہیے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین پر ناحق فساد کرتے ہیں۔ پھر ان تمام خصلتوں کے بیان کے بعد کہ جن کی تعداد دس سے زیادہ ہے‘ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۳﴾﴾

گویا ان آیات میں جو خصائل بیان ہوئے ہیں ان کی کثرت کو دیکھتے ہوئے لامِ تاکید کا اضافہ کیا گیا ہے جو کہ پہلی دو آیات میں قلت تعداد کی بنا پر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ ان تمام خصلتوں کے بعد جو جامع آیت آئی ہے‘ یعنی:

﴿فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۴۰)

’’اور جو معاف کرتا ہے اور اصلاحِ احوال کرتا ہے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔‘‘

یہ آیت خود ایمان کے ایک اعلیٰ درجے کی طرف اشارہ کر رہی ہے‘ اور اگر آخری آیت سے پہلے صرف یہی ایک آیت ہوتی تب بھی یہ آیت اپنی معنوی حیثیت کی بنا پر سورۂ آل عمران کی آیت میں دی گئی خصلتوں کے مقابلے میں زیادہ عمومیت کی حامل رہتی‘ کیونکہ وہ ساری باتیں‘ اس ایک آیت کے معنی و مفہوم میں شامل ہیں‘ اس لیے یہاں لامِ تاکید کا لایا جانا عین مناسب تھا اور اس کا الٹ مناسب نہ تھا‘ واللہ اعلم!

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)